عالمی بحران اور فیض احمد فیض کی معنویت

اکیسویں صدی کے دس سال گذر جانے کے باوجود ذہن اور فکر پر گذشتہ صدی کے اثرات ہنوز باقی ہیں کیوں کہ اس صدی کو "The most voilent century" سے منسوب کیا گیا ہے۔ ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو خدشات اور خوف و ہراس کی ایک عجیب سی ہولناک دنیا کا منظر نامہ کڑی در کڑی ہم تک پہنچتا ہوا نظر آتا ہے۔ بظاہر دنیا کے مختلف ممالک پر چھائے ہوئے جنگ کے بادل سمٹ چکے ہیں۔ ایٹمی خطرات کا خوف بھی مدھم پڑ گیا ہے۔ لیکن ایٹم اور ہائڈروجن بم کے ذخیرے نہ صرف باقی ہیں بلکہ ان میں مسلسل اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ دنیا کے اس تمام منظر نامے پر غور و فکر کرنے والے اور مختلف شعبوں میں مہارت رکھنے والے ماہرین جس طرح اپنے موضوع اور معروض پر نظر ڈالتے رہتے ہیں اور گذشتہ پچاس برسوں میں جس طرح کی کتابیں لکھی جا رہی ہیں، اگر ان پر نظر ڈالی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ کچھ بدلا نہیں ہے۔ وہی اضطراب ہے جو پچاس سال پہلے تھا، وہی خوف ہے جس کے تصور سے آج بھی دم گھٹتا ہے۔ یاد آ رہا ہے کہ ہربرٹ مارکوز نے One Dimensional Man جیسی کتاب لکھ کر بیک وقت دنیا بھر کے سوچنے والے ذہنوں کو اور زیادہ مضطرب کر دیا تھا۔ پھر ایلون ٹافلر کی Future Shock جیسی کتاب سامنے آئی اور دنیا ایک بار پھر لرز اٹھی۔ یہ صحیح ہے کہ صارفیت نے عام آدمی کے مسائل کو بہت سی آسائشیں اور آسانیاں فراہم کر دی ہیں لیکن آسمان پر خوف کی لکیریں آج بھی نمایاں ہیں اور مختلف رنگوں میں نظر آتی ہیں۔ 1950ء کے بعد سوچنے والے بیدار ذہنوں میں ایک شاعر ناصر کاظمی تھا جس نے ایک دن بے محابا ایک شعر کہا تھا:

طناب خیمہ گل تھام ناصر
کوئی آندھی افق سے آ رہی ہے

یہ آندھی آخر کون سی تباہیوں کی پیامبر تھی، یا کس طوفان کا پیش خیمہ تھی کہ ناصر کاظمی کو اپنا خیمہ گل غیر محفوظ نظر آ رہا تھا اور وہ شاداب پھولوں کے بکھرنے کے عمل سے پہلے ان کے تحفظ کا اہتمام کرنا چاہتا تھا۔ غزل میں اگر چہ بنیادی طور پر عشقیہ موضوعات کے اسالیب اور مفاہیم کارفرما رہتے ہیں لیکن ناصر کاظمی نے اس شعر میں خوف کے ماحول میں ڈوبی ہوئی دنیا کا ایک بڑا نازک استعارہ پیش کیا تھا۔ ایک ایسا استعارہ جس کے مفاہیم کی ایک وسیع کائنات تمام سوچنے والے ذہنوں پر محیط ہو گئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قیامت کی آندھیاں ہمارے عہد سے قریب ہو رہی ہیں اور زندگی کا شیرازہ بکھرنے کی منزل سے قریب ہے۔ دراصل کسی شاعر کی بقا کا دارومدار آنے والے زمانوں کے تصور کائنات پر ہوتا ہے۔ بڑے شاعر کسی پراسرار وجہ سے آنے والے زمانوں کے تصور ہائے کائنات کو اپنے گرفت میں لے لیتے ہیں اور جیسے جیسے زمانہ بدلتا رہتا ہے ویسے ویسے ان کی شاعری کی نئی جہتیں کھلتی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی میر، غالب اور اقبال کی شاعری کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ زندگی کا شیرازہ بکھر جانے کا جو احساس ناصر کاظمی کو تھا وہی احساس ان کے ہم عصروں اور بعد کے تمام بیدار ذہن تخلیق کاروں کو بھی تھا۔ اسی لئے اس عہد کے کم و بیش تمام بیدار ذہن تخلیق کاروں کی تخلیقات میں افق سے اٹھنے والی اس آندھی کی بشارت موجود ہے۔

فیض بھی انہیں تخلیق کاروں میں سے ایک تھے جو اعلیٰ انسانی اقدار اور انسان دشمن طاقتوں کو پہچانتے تھے۔ برصغیر کے سماجی حالات اور دنیا کے منظر نامے پر ابھرتی ہوئی فاشزم سے واقف تھے۔ ان کا دل ''ہیومنزم'' اور قوموں کی آزادی کے جذبے سے سرشار تھا۔ شاید اسی لیے ''فیض صدی'' ہندو و پاک کے علاوہ دیگر ممالک کے مختلف شہروں میں بھی دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے۔ فیض صدی کے موقع پر جگہ جگہ سیمینار، جلسے، ڈرامے، مشاعرے اور موسیقی کی محفلیں سجائی جا رہی ہیں۔ ان کی شاعری اور شخصیت پر بے شمار مضامین اور انٹرویوز، اردو اور انگریزی کے اخبارات و رسائل اور انٹرنیٹ پر شائع ہو چکے ہیں۔ کئی رسالوں کے خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان رسالوں کے اداریوں اور ان میں شائع ہونے والے مضامین میں زیادہ تر ناقدین نے فیض کو میر، غالب اور اقبال کے بعد سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔ فیض احمد فیض کی بیٹی منیزہ ہاشمی نے فیض صدی کے موقع پر انگریزی کے ایک اخبار کو دیئے ایک انٹرویو میں کہا ہے:

"His poetry has layers and not very easy to understand.All of them are writtenwith a certain perspective, all of them are written for that time but are relevant even today because we are still facing huge challenges (political, social and human rights challenges.)" (Downloaded from internet)

منیزہ ہاشمی کی یہ رائے کہ فیض کی شاعری تہدار ہے اور انہیں سمجھنا آسان نہیں ہے اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فیض نے کلاسیکی الفاظ، استعارے اور پیکروں کو سیاسی پس منظر میں استعمال کیا اور انہیں نئی معنویت عطا کی جنہیں سمجھے بغیر ان کو شاعری کو سمجھنا دشوار ہے۔ منیزہ ہاشمی کی یہ رائے درست ہے کہ فیض کی شاعری کی معنویت ہنوز باقی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فیض کی شاعری جس سماجی اور سیاسی پس منظر کی پیداوار ہے وہ پس منظر ابھی تبدیل نہیں ہوا ہے اور وہ جس تصورِ کائنات کی عکاسی کرتے ہیں وہ آج بھی موجود ہے۔ بقول فیض:

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی
لوسنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

دوسری بات یہ ہے کہ فیض کے نزدیک ان کا فن دل لگی یا بے کاری کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ وہ کہتے ہیں ''فن سخن (یا کوئی اور فن) بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے تو غالب کا دیدہ بینا بھی کافی نہیں۔ اس لیے شاعر یا ادیب کو قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے''۔ فیض نے فن سخن کے متعلق صرف اظہار خیال ہی نہیں کیا ہے بلکہ اسے برتا بھی ہے اور قطرے میں دجلہ دکھایا بھی ہے۔ اس لیے فیض کی شاعری میں اس آندھی کی بشارت موجود ہے جس کا اظہار ناصر کاظمی کے شعر میں ہوا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار فیض صدی کے موقع پر ہندو پاک اور دیگر ممالک کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے سیمیناروں اور جلسوں میں کافی کوٹ کیے گئے جنہیں موجودہ عرب انقلاب کے تناظر میں دیکھا جائے تو فیض کی شاعری کی عصری معنویت مزید روشن ہوگی اور یہ احساس ہوگا کہ ایک بڑا فن کار ماورائے زمان و مکاں ہوتا ہے اور اس کا وجدان مستقبل کو محسوس کر لیتا ہے۔

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو، کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھّے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

تازہ عرب انقلاب سرمایہ داری کے عالمی بحران کا اظہار ہے جس نے مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور اس کی گونج ساری دنیا میں سنائی دے رہی ہے۔ شمالی افریقہ اور مصر میں ہونے والے ڈرامائی واقعات انسانی تاریخ کا ایک فیصلہ کن موڑ ہیں۔ مصر اور تیونس کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہیگل کا یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ''ضرورت اپنا اظہار حادثات کی شکل میں کرتی ہے۔'' مصر کا انقلاب تیونس سے متاثر ہوا ہے لیکن اس کی بنیاد میں دیگر عوامل بھی کارفرما ہیں۔ مثلاً بڑے پیمانے کی بے روزگاری، گرتا ہوا معیارِ زندگی اور جابر حکومت کے خلاف نفرت۔ اس کے علاوہ مصری قوم پر طاقتور ملکوں اور سامراجی غلبے کی وجہ سے ان کے ذہنوں اور دلوں میں سلگنے والا ذلت کا احساس بھی کارفرما تھا۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آغاز ہی میں اسے ''دہشت کی صدی'' سے موسوم کیا جانے لگا ہے لیکن امریکہ اور یوروپ جسے دہشت گردی سمجھتے ہیں وہ دراصل طاقتور ملکوں کے خلاف احتجاج ہے۔ اصل دہشت گرد تو وہ طاقتور ممالک ہیں جنہوں نے کیمیکل بم اور مفروضہ دہشت گردی کی آڑ میں کئی کمزور ملکوں کو برباد کر دیا اور لاکھوں معصوم انسانوں کو دہشت گردی کے نام پر مار ڈالا۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی ناانصافیوں کے خلاف جہاد چھیڑنا دہشت گردی نہیں ہے، انقلاب ہے۔ اسی لیے انقلاب پسند وہ راہ اپناتا ہے جس کی طرف فیض نے اپنے اشعار میں یوں اشارہ کیا ہے:

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے
جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے
غرورِ سروسمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس وائ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

دراصل بڑی طاقتیں دنیا کو ایک بازار کی طرح دیکھتی ہیں اور اس بازار میں اپنی برتری حاصل کرنا چاہتی ہیں اس لیے کمزور ملکوں کے قدرتی ذرائع پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں لیکن احتجاج کرنے کی صورت میں دہشت گردی کے نام پر ان ملکوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ میڈیا بھی ان کی مدد کرتی ہے اور پوری دنیا میں ایسی سائیکی پیدا کر دیتی ہے کہ ہر شخص اصلی دہشت گرد کو مسیحا اور امن کا پیامبر سمجھتا ہے جبکہ حق کی لڑائی لڑنے والے مظلوموں کو دہشت گرد۔ لیکن بیدار ذہن تخلیق کاروں نے ان بڑی طاقتوں کی سازش کو سمجھا اور عوام کو بھی آگاہ کیا۔ امریکہ اور یوروپ کی ایٹمی اور جدید ترین فوجی طاقت پر غرور اور دنیا کے تازہ احوال کے تناظر میں فیض کے ان اشعار کی معنویت آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی:

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

فیض جب قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا تھے اور ان پر مقدمہ چلانے کی تیاری ہو رہی تھی اس وقت انہوں نے اپنے چند اشعار میں عدالتی ڈھونگ کی طرف جو طنزیہ اشارے کئے تھے اب انہیں صدام حسین کے خلاف چلائے گئے مقدمے اور اس طرح کے نام نہاد مقدموں کے انجام کے تناظر میں دیکھے جا سکتے ہیں:

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھئے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطاکار سرِدار کھڑے ہیں

1977 میں پاکستان کی فوجی بغاوت کے بعد فیض ''لوٹس'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بیروت چلے گئے تھے۔ انہوں نے اس رسالہ کے ذریعہ نہ صرف افرو ایشیائی مصنفین ایسوسی ایشن کی تحریک چلائی بلکہ لاطینی امریکہ کے مصنفین کی بھی تحریک چلائی اور ساتھ ہی اسے تیسری دنیا کی آزادی اور ترقی کا فورم بھی بنا دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب ممالک انتشار اور شکست و ریخت سے دوچار تھے۔ فیض نے لوٹس کے اداریوں اور اپنی نظموں کے ذریعہ طاقتور ملکوں کو للکارا اور عرب، لاطینی امریکی اور افریقی تخلیق کاروں اور دانشوروں کو سامراج دشمن تحریک سے جوڑ کر اس کو نئی معنویت عطا کی۔ اسی دوران فیض نے ''دعا'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کی معنویت موجودہ عالمی بحران میں بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ اس وقت تھی:

جن کا دین پیروئ کذب وریا ہے ان کو
ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں، ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

یہی وہ زمانہ تھا جب اسرائیل کا ظلم و ستم اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ اسرائیل کی فوجیں مہاجر کیمپوں پر بھی بمباری کر کے ان کی نسل کشی کر رہی تھیں۔ فیض وہاں کے حالات دیکھ کر لرز گئے تھے۔ اس وقت انہوں نے فلسطین اور وہاں کی مظلوم عوام کے لیے چند اشعار کہے تھے جو وہاں کی عوام کے دل کی ترجمان ہیں:

مقتل میں نہ مسجد نہ خرابات میں کوئی
ہم کس کی امانت میں غمِ کارِ جہاں دیں
شاہد کوئی ان میں سے کفن پھاڑ کے نکلے
اب جائیں شہیدوں کے مزاروں پہ اذاں دیں

مندرجہ بالا اشعار میں فلسطینیوں کا المیہ فیض کی ذات کا المیہ بن گیا ہے۔ اس لیے یہ اشعار نہ صرف فلسطینیوں کے دلوں کی آواز ہیں بلکہ یہ دنیا کے تمام مظلوموں کے دل کی دھڑکن ہیں۔ اس لیے ان اشعار کو موجودہ دور میں تمام مسلم ممالک میں ہو رہی غارت گری اور نسل کشی سے جوڑ کر دیکھا جا سکتا

ہے۔اسرائیل اور فلسطین کے درمیان برسوں سے چلی آرہی خوں ریز تنازعہ کا حل نکل چکا ہوتا اور ان ملکوں کے درمیان امن قائم ہو چکا ہوتا اگر امریکی حکومت کی پالیسیاں غیر جانبدارانہ ہوتیں۔اسرائیلا فلسطین کے درمیان مفاہمت اور عرب ممالک میں آئے تازہ انقلاب کے متعلق امریکی صدر کی حالیہ تقریر کے تناظر میں فیض کے مندرجہ ذیل اشعار کی معنویت آج بھی قائم ہے:

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں

دراصل اس خطّہ میں امن وامان بحال کرنے کی بات ہمیشہ کی جاتی ہے لیکن طاقتور ملکوں کی دوہری پالیسیاں بدستور جاری رہتی ہیں جو امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔

بیروت میں دوران قیام فیض نے دو اور اہم نظمیں لکھی تھیں جن میں ایک کا عنوان ہے ''فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے'' اور دوسری نظم کا عنوان ہے ''فلسطینی بچے کے لیے لوری''۔یہ دونوں نظمیں ''ہیومنزم'' کے جذبے سے سرشار ہیں۔ان نظموں کو دنیا کے ان تمام ملکوں کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے جہاں کی عوام حق کی لڑائی میں شہید ہورہے ہیں اور ان کے بچے یتیم ہورہے ہیں۔فیض نے 1982 میں ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان تھا ''ایک ترانہ مجاہدین فلسطین کے لیے'' جس میں انہوں نے ہمت اور حوصلے سے جینے کی ترغیب دی ہے۔: ہم جیتیں گے/حقّا ہم اک دن جیتیں گے/بالآخر اک دن جیتیں گے/ کیا خوف زیلغارِ اعدا/ہے سینہ سپر ہر غازی کا/ کیا خوف زیورشِ جیشِ قضا/صف بستہ ہیں ارواح الشہدا/ڈرکا ہے کا/ہم جیتیں گے/حقّا ہم جیتیں گے/**قَد جاء الحقُّ وَزَھق البَاطِل**/ فرمودۂ ربِ اکبر..... بالآخر اک دن جیتیں گے۔اس نظم کا اطلاق بھی موجودہ صورتِ حال میں ان ملکوں کی عوام کے لیے کیا جاسکتا ہے جو طاقتور ملکوں کی بربریت سے ہمت ہار چکے ہیں۔یہ نظم ہارے ہوئے ملکوں کی عوام کو حوصلہ دیتی ہے۔

فیض احمد فیض دنیا کو سمجھنے سے زیادہ دنیا کو برتنے کا اصول فراہم کرتے ہیں اور اس پیچیدہ دنیا میں عزت سے جینے کی ترغیب دیتے ہیں۔وہ ہمیں کسی بھی مقام پر جھکنے اور شکست قبول کرنے کی راہ نہیں دکھاتے۔وہ ہمیں ترغیب دیتے ہیں کہ: آج بازار میں پابجولاں چلو/دست افشاں چلو،مست ورقصاں چلو/ خاک برسر چلو،خوں بداماں چلو/راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو.....رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو/پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو۔

فیض کی شاعری اور کئی تحریریں معنویت اور عالمگیریت کے حوالے سے آج بھی اتنی ہی زندہ ہیں جتنی کل تھیں۔ماسکو میں جب انہیں ''لینن امن انعام'' دیا گیا تو انہوں نے اس موقع پر ایک تقریر کی تھی جس کی معنویت 21 ویں صدی کی دوسری دہائی کے آغاز میں بھی موجود ہے۔امن کے بارے میں فیض کا خیال ہے:

> ''یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سبھی تصور کرسکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت،دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ،شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب

صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری۔ اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہئے۔ لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتداء سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں۔ یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیّتوں سے بھی فرق ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے۔ نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں امنِ آدم کی بقا اور فنا، بقا اور فنا۔ ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے۔ انہیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے۔ یہ پہلا فرق ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی ہی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکتیں۔ اس لیے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود ہے، لیکن اب یہ صورت نہیں ہے۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا ذخائر، پیداوار کے یہ بے اندازہ خرمن، بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکینِ ہوس کے لیے نہیں، بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لیے کام میں لائے جائیں اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کی ڈھانچے بنائیں، ہوسِ استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری، آزادی اور اجتماعی خوش حالی میں اٹھائی جائیں''

(دستِ تہِ سنگ، ص-11، نسخہ ہائے وفا، ص-304-305)

فیض کی شاعری کا جوہر یہی ہے کہ وہ امن و انقلاب کی مشعل روشن کرتی ہے۔ وہ جبر و ستم، ناانصافی کے خلاف حوصلہ عطا کرتی ہے لیکن فیض نے ان مقاصد کے حصول میں شاعری کی اصل روح کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ فیض کے جو شعری تصورات ہیں ان کی تعبیریں موجودہ انقلابات میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس لیے فیض آج بھی اتنے ہی Relevent ہیں، جتنے کل تھے۔ موجودہ عالمی بحران کے تناظر میں فیض کی شاعری کی معنویت اور بڑھ گئی ہے اور جب تک دنیا میں سامراج وادزندہ رہے گا، ریاستی دہشت گردی جاری رہے گی اور کمزور طبقوں پر ظلم و ستم ہوتا رہے گا۔ فیض کا آہنگِ انقلاب عوامی شعور کا حصہ بنتا جائے گا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ فیض ایک ایسے شاعر ہیں جن کی آواز میں مستقبل کے امکانات اور ادراکات پنہاں ہیں۔

Residence: 262-D, Shipra Sun City, Indirapuram, Ghaziabad-201014
Mobile No: 09911796525
Website:people.du.ac.in/~aahmad